R. N. 2186 57 Regd. No A 927

انجمن ترقی اردو ہند کا پندرہ روزہ اخبار

Telephone No. 19
Telegrams "ANJUMAN"

ہماری زبان

جلد ۲۱ - شمارہ ۲ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ جنوری ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر تاراچند صاحب ایم اے ڈی فل

اردو مشترکہ تہذیب و تمدن کی پیداوار ہے

(آندھرا پردیش اردو کانفرنس کا خطبۂ صدارت)

آپ نے مجھے آندھرا پردیش کی اردو کانفرنس کی صدارت کے لئے منتخب کیا اور میری قدر اور منزلت بڑھائی۔ میں اس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے اس عزت کے قبول کرنے میں بہت تامل تھا اور اس کی کئی وجوہات تھیں۔ میں اردو زبان اور ادب کا نیک خواہ ہوں اور تہ دل سے اردو کی ترقی چاہتا ہوں لیکن میں نے اردو کی کوئی ایسی نمایاں خدمت انجام نہیں دی جس کے لئے مجھے اس کرسی پر بیٹھنے کا حق حاصل ہو۔ اس سے بڑھ کر میری ایک اور دشواری ہے۔ اردو کا کارواں آج ایک ایسے موڑ پر آ کر رکا ہے جہاں ایسے سالار کی ضرورت ہے جو اسے اس صحیح راستہ پر لے چلے جو منزل مقصود کی طرف جاتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ آپ نے اس ہستی کو اس ذمہ داری کے لئے چنا ہے جو آپ کی رہنمائی کا دعویٰ کر سکے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی زبانوں کے متعلق میرے اپنے خصوصی خیالات ہیں۔ میں نہیں جانتا کہاں تک آپ صاحبان ان سے اتفاق کریں گے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ جس زمانہ میں مہاتما گاندھی زبان کے مسئلے پر غور کر رہے تھے میں نے مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہونی چاہئے۔ مجھے بڑا فخر ہے کہ انھوں نے میری ناچیز رائے مانی اور ہندوستانی پرچار سبھا کو قائم کیا۔ ہندوستانی تحریک سے میرا تعلق اور اس کے بنیادی اصولوں سے میرا اتفاق میری مجبوریوں کو بڑھا دیتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اب زمانہ بدل چکا ہے اور وہ سنہرے خواب جو کسی وقت ہمارے دلوں کو گدگداتے تھے اور ہمارے ذہنوں کو ایک روشن مستقبل کی طرف چلنے کی ہدایت کرتے تھے ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں ان کی جگہ دوسرے نقشوں نے لے لی ہے اور آئندہ کی نئی تجویزوں اور نئے منصوبوں کی تصویریں ہمارے سامنے آ رہی ہیں لیکن کیا کیجئے! جس تبدیلی نے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ قومی نصب العینوں کو پلٹ دیا اور ہمارے شعور کو تذبذب کے دھارے پر چھوڑ دیا اس کے لئے ہمارے ذہن تیار نہ تھے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس نئی فضا میں کس طرح زندگی بسر کریں۔ نئی دنیا سے ہم آہنگ ہونے کے لئے وقت کی ضرورت تھی۔ اس کی ہمیں مہلت نہ ملی۔ مگر زمانہ چاہے کتنی کروٹیں بدلے سماج اور راج چاہے جو روپ دھارن کریں کچھ انسانی جوہر ایسے ہیں جو ہمیشہ اپنی ذات پر قائم ہیں وہ اٹل ہیں اور امر ہیں، ان کا عمل انسان کے جنم دن سے آج تک جاری ہے۔ ان کی نیو پر ہمارے سماج کی عمارت کھڑی ہے اور یہی ہمارے راج کی آتما ہیں۔ تہذیب اور تمدن اور زبان و ادب اسی سے پرورش پاتے ہیں پھلتے اور پھولتے ہیں۔ ان ہی کی روشنی میں زبانوں کی نشوونما اور ترقی کا جائزہ لیا جائے تو ممکن ہے آگے کا راستہ کسی قدر صفائی کے ساتھ دکھائی دے۔

میرے لئے مشکل یہ ہے کہ اپنے ذہنی سرمایہ کو جسے بڑی محنت سے میں نے سمیٹ کر جمع کیا ہے اور جس میں وہ قدریں شامل ہیں جنھیں الگ نہیں کیا جا سکتا، زمانے کے ہاتھوں لٹا دوں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ اپنے الجھے سلجھے خیالوں کو آپ کے سامنے پیش کروں، امید ہے آپ کے لئے یہ ناگوار ثابت نہ ہوں گے پھر

چوں من خراب و مست را در خانۂ خود رہ دہی
پس تو ندانی ایں قدر ایں بشکنم آں بشکنم

پہلا مسئلہ جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے زبان کا ہے اردو زبان کی ابتدا اور ارتقاء کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس کے دہرانے کا یہاں موقع نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن ضرورتوں نے

اسے ختم دیا گیا وہ ختم ہو چکیں یا ابھی باقی ہیں۔ اگر باقی ہیں تو ظاہر ہے اُردو کے لئے اس ملک میں ابھی جگہ ہے اور اگر جگہ ہے تو لازم ہے کہ اس سماجی آلہ کو موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل بنایا جائے اور اس پہ وہ قدغیں نہ لگائی جائیں جو اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کریں۔ چھ سو سال کی تاریخ میں اُردو زبان پر کئی مرتبہ انقلاب آئے اور یہ ہر زبان کا معمول ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ کے پردے میں کیا کیا تبدیلیاں چھپی ہیں لیکن اس کا پتہ لگانا اور زبان کو سماجی وجدان کا رازدار اور سماجی جذبوں کا ظاہر کرنے والا سماجی مقصدوں کا حامی اور مددگار بنانا زبان کے رہنماؤں کا فرض ہے۔ یہ رہنما ادیب اور شاعر ہیں جن کے دل سرود بربط ہستی سے ہم نوا ہیں۔ ان کی روح کے تاروں کو زندگی کے کول سُر چھیڑتے ہیں ان سے وہ راگ نکلتے ہیں جو ساری سماج کو مجسم سنگیت بنا دیتے ہیں۔

بارھویں صدی کا چوتھا چرن ہے۔ انسانوں کے اس سوریے میں جس کا نام ہندوستان ہے، سب نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ منڈا، دراوڑ اور آریہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہندو، بودھ، جین اور عیسائی اپنے اپنے دھرموں کا پالن کرتے ہیں۔ تاریخ کا تقاضہ ہے کہ دنیا میں ایک اور مذہب ہے، اسے بھی یہاں جگہ ملنی چاہئے دیش کا ہر دے وشال ہے۔ مہمان کا انادر پاپ ہے۔ ایک آریہ جاتی خراسان اور ایران کی رہنے والی ہندی آریاؤں کی بہن آریہ بھاشا بولنے والی اس عربی مذہب کو لئے ہوئے آتی ہے اس کے لئے کیوں نہ دروازے کھلے ہوں۔

دو قوموں، مذہبوں اور زبانوں کا سنگم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے میل جول بڑھتا ہے۔ ہاٹ بازار میں، گلی کوچے میں، شہر و دیہات میں ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے۔ آخر انسان ہیں لڑتے جھگڑتے بھی ہیں، پھر سمجھنے کی کوشش اور پیار بھی کرتے ہیں۔ اپنی کہتے ہیں ان کی سنتے ہیں۔ ایک ڈھنگ نکل آتا ہے۔ ایک ملی جلی زبان چلنے لگتی ہے۔ اسے بہت دنوں بعد اُردو نام دیتے ہیں۔ اصل میں تو یہ وہی بولی ہے جسے شاہ برہان الدین جانم نے ہندی کہا ہے۔

ہندی بولی کیا بکھان ● جس کے پرساد تھا مجھے گیان

شیخ اشرف اور وجہی نے اسے ہندوی کہا اور غالب نے ہندی اور ریختہ، اِن اُردوئے معلی اور فرنگیوں نے ہندوستانی۔

اُردو نام یوں پڑا کہ اُردو شاہی کیمپ کو کہتے ہیں۔ اس کیمپ میں شاہ اور شاہزادے، امیر اور منصب دار، فوجی اور اُن کے افسر، دوکاندار اور کاریگر، عملے اور نوکر اور مرد عورت اور بچے سب ہی لوگ جو ایک دوسرے کا سہارا لئے رہتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی اور یہیں وہ ضرورتیں پیش آئیں جنھوں نے ایک دوسرے کو باہمی لین دین پر مجبور کیا۔ لشکر سے زبان اردگرد کے علاقوں میں پھیلی اور جب محمد بن تغلق نے دلّی کے کیمپ کو دولت آباد منتقل کیا تو یہ زبان دکن میں جا پہنچی۔

دلّی کی کھڑی بولی نے جو شورسینی اُپ بھرنش کی اولاد تھی، فارسی کے اسموں اور صفتوں کو اپنایا، مگر فعلوں اور حرفوں کو ترتیب قریب ویسے ہی رہنے دیا۔ فارسی دور کی رشتہ دار تھی۔ جس طرح سنسکرت اور پراکرت سے بدل کر اُپ بھرنش اور بولیاں بنی تھیں اسی طرح پرانی ایرانی اوستائی سے پہلوی اور پہلوی سے فارسی نکلی تھی۔ ہندوستان اور ایران کی زبانیں کچھ یکساں اصولوں کے مطابق بدلی تھیں، اس لئے ان کی آوازیں ایک دوسرے کے قریب تھیں مثلاً سنسکرت اور اوستائی دونوں زبانیں اکثر لفظوں کو جڑواں حرفوں سے شروع کرتی ہیں۔ جیسے

دکن کے شاعروں اور ادیبوں کی زبان اسی طرح ساری ہندی یا ہندوستانی کا نمونہ ہے۔ دیکھئے سلطان محمد قطب شاہ کی غزل ہے:

پیا باج پیالا پیا جائے نا ● پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہیتے پیا بن صبوری کروں ● کہیا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے ● کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا

قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند
دوانے کوں کچھ پند دیا جائے نا

یہ پیاری غزل قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کی شاہی کے بعد اپنے وطن دلّی کو لوٹی وہاں علامہ ابوالفضل کی معرّب فارسی کا دور دورہ تھا۔ اور کشمیری اور خراسانی امیر تو پہلے سے ہی شہنشاہی دربار کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کے دور میں بہت سے ایرانی، ہندوستان آئے اور اونچے اونچے منصبوں پر مقرر ہوئے اسد خاں جیسے سر کھلے لوگوں نے وزارت کا قلمدان سنبھالا۔ فارسی اور وہ فارسی جو صفویوں کے آخری زمانہ کی یادگار ہے ادبی پر چھا گئی علماء کو بھی یہ زبان بھائی کیونکہ اس میں وقار اور دبدبے کا طنطنہ کھنکھنا تھا۔

ولی دکھنی وطن چھوڑ مغلوں کی راجدھانی میں پدھارے تو انھیں سعد اللہ گلشن نے مشورہ دیا جو سننے کے قابل ہے کہ:

"ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند
در ریختہ خود بکار ببر از تو محاسبہ خواہد گرفت کہ
شاہ زبان دکنی را گزاشتہ ریختہ را موافق اردوئے
معلی شاہ جہاں آباد موزوں بکنید"

(میر تقی میر۔ نکات الشعراء)

دہلوی شاعران شہر میں مقال اس زبان پر ایسے موجہت ہوئے کہ انھوں نے ہندوستانی کا جون ہی پلٹ دیا۔

صفیر بلگرامی نے تذکرہ جلوۂ خضر میں ان متروکات کی لمبی فہرست دی ہے جنھیں خواجہ میر درد اور میر تقی میر وغیرہ نے اپنے اپنے کلام سے نکال دیا۔ ان میں نین، من، سجن، ساجن، پیتم، پیا، نس، تجنا، سنسار، جگ، برھا، پچھتر، درشن، دوجا، لگ، باج، مانس، موہن، نندن، درسن، درپن، بکن، تن، انجھو، جیو، شامل ہیں (ملاحظہ ہو شعر الہند، حصہ اول مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی)

(باقی صلا پر)

اداریہ

ادبی مسائل

۵

مشاعروں کے متعلق ہم کئی بار اظہار خیال کر چکے ہیں، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذوق نغمہ کی کم یابی کے ساتھ نوا کو تیز کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ ہم مشاعروں کے خلاف نہیں ہیں، ہمیں ان کی افادیت کا اعتراف ہے۔ ان کے ذریعہ سے شاعر کو اپنے خیالات ایک وسیع حلقے تک پہنچانے کا موقع ملتا ہے۔ وہ لوگ جو کسی وجہ سے اُردو شاعری کا مطالعہ نہیں کر سکتے وہ کم سے کم شاعر کا کلام تو سُن سکتے ہیں۔ اُن کے حافظے میں اردو کے کچھ اچھے شعر تو محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح زبان سے دلچسپی تو بڑھتی ہے اور اُردو کی مقبولیت تو عام ہوتی ہے۔ شاعر کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اسے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ سُننے والوں کے کتنے درجے ہیں اور ان کی دلچسپیوں کے محور کیا ہیں۔

مگر موجودہ دور میں جب قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں اور تہذیبی خصوصیات میں بڑی سُرعت سے انقلاب ہو رہا ہے، اچھے خاصے تہذیبی اداروں کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ مشاعرے شعرا کا کلام سُننے کے لئے ہیں۔ یہ جاہ و منصب کی نمایش، تہذیب کی اوپری سرپرستی موسیقی سے شغف، سستے تفریحی پہلوؤں کی تسکین کا ذریعہ نہیں۔ مشاعروں میں صدر کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ ہر شاعر کو اپنا کارنامہ پیش کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس کے چند تعارفی کلمات سے شاعر کے لئے فضا بنتی ہے۔ وہ پرانے یا نئے رنگ، تحت اللفظ یا ترنم کے ساتھ پڑھنے میں توازن قایم رکھتا ہے۔ وہ کبھی شاعر کے تکلفات پر پردہ ڈالتا ہے، کبھی سننے والوں کی بے تکلفی کو حد سے بڑھنے سے روکتا ہے، یہ کام وہی کر سکتا ہے جو خود سخن فہم ہو، جس کی داد کے شاعر منتظر رہیں، جس کی نظر وسیع ہو اور شاعری کے ہر رنگ پر ہو۔ ایک سرکاری افسر یا ایک سیاسی لیڈر یا قومی رہنما یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ افسوس ہے کہ صدارت کے لئے انتخاب میں ساری مصلحتیں ملحوظ ہوتی ہیں، سب سے ضروری پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے۔ پھر شعرا کے انتخاب میں ادبی تقاضوں کو کم، مقامی مصلحتوں کو زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ شاعری پر زور کم ہوتا ہے، ترنم پر زیادہ۔ ادھر خواتین بھی اپنا کلام مشاعروں میں سُنانے لگی ہیں۔ چنانچہ مشاعروں کے منتظم ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ خواتین کو ضرور بلائیں خواہ وہ شعر کیسے ہی کہتی ہوں۔ اگر زہرا نگاہ یا ادا جعفری یا رابعہ پنہاں اور اسی پائے کی دوسری خواتین اپنا کلام سنائیں تو کیا کہنے۔ مگر مشاعرے کی کامیابی کے لئے کچھ خواتین کو لازمی طور پر مدعو کرنا خواہ شاعری میں ان کی کوئی امتیازی حیثیت نہ ہو، شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ اسی طرح مشاعروں میں فلم ایکٹروں یا ستاروں کو بلانا بھی بد مذاقی ہے۔ فلم اسٹاروں کا دائرہ الگ ہے۔ بقول جگر، جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے، اسے دوسرے میدان میں نہیں لانا چاہئے۔ اسی طرح ترنم پر اس قدر زور دینے سے مشاعرہ اچھی خاصی قوالی کی محفل بنتا جا رہا ہے۔ ہم قوالی کے خلاف نہیں ہیں، لیکن قوالی اور مشاعرے کے فرق پر اصرار کرتے ہیں۔ دراصل جدید دور میں جہاں ریڈیو اور سینما نے تہذیب کی خدمت کی ہے، وہاں بعض قدروں کو مسخ بھی کر دیا ہے۔ موسیقی کا پاکیزہ ذوق بڑی دولت ہے، مگر شاعری کی اپنی موسیقی کیا کم ہے۔ موسیقی کے سہارے معمولی شاعروں کی ہمت افزائی غلط بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اُن لوگوں کو جو اُردو شاعری کے بلند معیار سے واقف نہیں ہیں اور جنھیں اتنی فرصت نہیں کہ وہ توجہ سے شعرا کا کلام سُن کر کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں، ہم گمراہ کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اُردو شاعری یہی ہے۔ حالانکہ ہمارے شعرا نے زندگی کی ہر کروٹ کا ساتھ دیا ہے، اور وقت کی ہر لہر کو محسوس کیا ہے اور آج بھی اس میں فکر و فن کی صالح روایات اور نادر تجربات کی روح موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اچھے مشاعرے اتنے مقبول نہ ہوں، مگر معیار کو ملحوظ رکھنے کے لئے اتنی قربانی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ ہاں شاعری کی خدمت کا صرف دعویٰ کرنا اور اصل مقصد صرف سستی تفریح اور تھوڑی دیر کی دل لگی کا سامان مہیا کرنا ہے تو دوسری بات ہے۔

اِدھر اُدھر سے

بنارس میں مرزا غالب کا جشن یوم ولادت

۲۷ر دسمبر سنہ ۶۱ء۔ ناگری پرچارنی سبھا بنارس میں مرال پبلیکیشنز کی طرف سے مرزا غالب کا جشن یوم ولادت منایا گیا۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر برج موہن صاحب پرنسپل سنٹرل ہندو کالج بنارس نے انجام دیے۔ مولانا خیر بہوروی نے مرزا غالب پر کئے گئے کام کی تفصیل پیش کی۔ انھوں نے بتایا کہ اس بات کا فخر صرف بنارس کو حاصل ہے کہ وہاں مرزا غالب کا سب سے پہلا جشن یوم ولادت منایا جا رہا ہے۔ جناب مبین صاحب نے مرزا غالب کی ایک غزل ترنم سے سنائی۔ جناب نذیر بنارسی نے اپنی ایک نظم سے مرزا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب دیوی نراین ایڈوکیٹ نے مرزا کی بنارس میں آمد کی تفصیل

پیش کی۔ جناب حکم چند صاحب نیر نے مرزا کے فکر و فن اور فلسفیانہ کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ مرزا غالب اُردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے ہاں غور و فکر کے ساتھ ساتھ گہرائی اور گیرائی بھی پائی جاتی ہے۔ مرزا کا کلام اپنی نغمگی سے دلوں کو گرماتا ہے اور گہرائی سے ہمارے اذہان کو روشنی بخشتا ہے۔ ہندی کے مشہور شاعر جناب رودر نے مرزا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ہندی داں حضرات کو مشورہ دیا کہ وہ نہ صرف غالب کو بلکہ تمام اُردو ادب کو سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کریں۔ جناب آغا رشید منظر نے کہا کہ غالب ایک عدیم المثال فنکار تھے۔ نیز یہ کہا کہ اٹھارویں صدی نے اُردو کو غالب دیا اور انیسویں صدی نے ڈاکٹر اقبال۔ ہر دو کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر اقبال کا حلقۂ اثر ایک خاص طبقے کے لئے ہے جبکہ مرزا غالب ایک آفاقی حیثیت کے مالک ہیں۔

ڈاکٹر برج موہن صاحب صدر جلسہ نے غالب مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے حکومت ہند سے اپیل کی کہ وہ مرزا غالب کی ایک مہتم بالشان یادگار قائم کرے۔

شری مراری لال کیڈیا نے ناگری پرچارنی سبھا کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ سبھا کے ہال میں ہندی کے مشاہیر شعرا کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کا ایک مرقع بھی آویزاں کیا جارہا ہے جس پر حاضرین نے مسرت کا اظہار کیا۔ آخر میں جناب رام چندر ورما ایڈیٹر مرال نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔　　(حکم چند نیر ایم۔ اے)

بنارس ہندو یونیورسٹی میں پنڈت مالویہ کی سو سالہ برسی

۲۶ دسمبر ۶۱ء۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے بانی آنجہانی پنڈت مدن موہن مالویہ کے مجسمہ کی نقاب کشائی کرتے ہوئے ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن نائب صدر جمہوریۂ ہند نے پنڈت مالویہ مرحوم کے صد سالہ یوم پیدائش کے جشن کا افتتاح کیا۔

سب سے پہلے آنجہانی پنڈت مالویہ کی ایک تقریر کے ریکارڈ بجائے گئے۔ نائب صدر جمہوریہ ہند کا استقبال کرتے ہوئے جسٹس این۔ ایچ۔ بھگوتی وائس چانسلر بنارس ہندو یونیورسٹی نے فرمایا کہ یونیورسٹی پنڈت مدن موہن مالویہ کی ایک زندہ یادگار ہے۔ یہ مجسمہ اس لئے نصب کیا گیا کہ ہماری قوم اس عظیم درویش منش انسان کی زندگی سے درس عمل لے۔

جناب ڈاکٹر رادھا کرشنن نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ حقیقی مذہب کی خصوصیات 'سچائی' 'عدم تشدد' اور 'بے خوفی' ہیں۔ یہی خوبیاں مذہب کی روح رواں ہیں۔ چونکہ یہ خصوصیات پنڈت مالویہ مرحوم میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں اس لئے وہ صحیح معنی میں سچے مذہبی آدمی تھے بنی نوع انسان کے مصائب و تکالیف پر اُن کا دل کڑھتا تھا اور وہ ہمیشہ ان مصائب سے نجات دلانے کے لئے کوشاں رہتے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے بتایا کہ ہمارا ملک قدیم الایام سے مشہور عالم رہا ہے اس لئے کہ اہل ہند ہمیشہ سے 'سچائی' 'عدم تشدد' 'بے خوفی' کے پجاری رہے ہیں۔ موصوف نے ہزاروں طلبہ سے اپیل کی کہ وہ یونیورسٹی کے بانی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔　　(حکم چند نیر۔ ایم اے)

مہاراشٹر اُردو بکسیلرز اوارڈ کمیٹی کا اہم اعلان

مہاراشٹر اُردو بکسیلرز اوارڈ کمیٹی کی سالانہ جنرل میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سال گذشتہ کی طرح اس سال بھی کمیٹی سال بھر (جنوری تا دسمبر ۱۹۶۱ء) میں شائع ہونے والی اُردو اور مراٹھی کتابوں میں سے انتخاب کرکے انعامات دے گی۔

تین انعامات اُردو کی طبعزاد تصانیف پر دئے جائیں گے اور ایک انعام مراٹھی کی ایسی کتاب پر دیا جائے گا جو اردو کی کسی کتاب کا ترجمہ، انتخاب یا اُردو سے متعلق کوئی طبعزاد تخلیق ہو۔

صرف انھیں مصنفین کی کتابوں پر غور کیا جائے گا جو کم از کم ایک سال سے ریاست مہاراشٹر میں مقیم ہوں کتابیں خواہ مہاراشٹر میں شائع ہوئی ہوں یا ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے میں۔

کمیٹی اُردو اور مراٹھی کے پبلشرز اور مصنفین سے درخواست کرتی ہے کہ اگر ان کی کتاب یا کتابیں مذکورہ شرائط پوری کرتی ہوں تو ان کی دو جلدیں جنرل سکریٹری کے نام بذریعہ رجسٹرڈ بک پوسٹ ۲۵ جنوری تک بھیج دیں تاکہ ان پر غور کیا جاسکے۔

جنرل سکریٹری مہاراشٹر اُردو بکسیلرز اوارڈ کمیٹی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

نوٹ: گذشتہ سال کمیٹی نے اُردو کی دو کتابوں (انداز نظر۔ صفیہ اختر اور فردوسی ہند۔ صفدر آہ) اور مراٹھی کی ایک کتاب ([illegible] داما۔ پروفیسر جوشی) پر انعام دیا تھا۔

"دائرۂ فکر و نظر" گیا کی ہفتہ وار نشست

۳۱ دسمبر ۱۹۶۱ء کو "دائرۂ فکر و نظر" کی چودھویں (۱۴) تنقیدی نشست جناب مسعود امام کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ حاضرین کی تعداد بھی زیادہ تھی اور کچھ نئے ممبران نے بھی دلچسپی کا اچھا مظاہرہ کیا۔ رہبر خالدی کی نظم "آزادی کے بعد" کو کافی سراہا گیا۔ ثمر سہروردی کی چھوٹی بحر کی غزل بھی کامیاب رہی۔ نئے ممبر جناب غنی حیدر کی غزل پہلی تخلیق کے اعتبار سے اچھی سمجھی گئی۔ مسعود امام صاحب نے "ایک خط" سنا کر غالب کی یاد تازہ کر دی۔

آخر میں حضرت تنویر بھوجپوری نے ایک چھوٹی ردیف میں غزل سنا کر ممبران کو ذوق و فکر کا ایک وسیع میدان عطا کیا۔　　(معتمد)

محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر

یادِ امجد

آہ اے امجد! تجھے دنیا بھلا سکتی نہیں
بات جو تھی تجھ میں وہ اوروں میں آسکتی نہیں

اک قلندر آہ! اقلیمِ سخن سے اُٹھ گیا
تاج دارِ علم و فن، بزمِ سخن سے اُٹھ گیا

تو نے صبر و شکر سے کیسے مراحل طے کئے
دل کی کشتی غرق تھی، سانسوں سے ساحل طے کئے

رود موسیٰ کا وہ طوفاں! اور تنہا تیری جاں
پانی ہی پانی نظر آتا تھا زیرِ آسماں!

یادِ دیرینہ کی ہر منزل شریکِ غم بنی
اور تری حساس فطرت گردشِ پیہم بنی

حق پرستی میں لباسِ فقر زیبِ تن کیا
من کی دُنیا جاگ اُٹھی ایسا دیا روشن کیا

ہر رباعی سے تری پیدا انوکھی شان ہے
یا حدیثِ مصطفیٰؐ، یا آیتِ قرآن ہے

تو فقط شاعر نہ تھا اے سالکِ ذی احترام
زندۂ جاوید و عالم گیر ہے تیرا نام

تیرے سوز و درد سے شمعِ سخن روشن ہوئی
تیری آہِ سرد! فصلِ گل ہوئی گلشن ہوئی

نام ہے روشن ترا اے شاعرِ روشن ضمیر
رہتی دنیا تک تری ہر بات، پتھر کی لکیر!

تیری عرفانی نوا میں زندگی کا راز ہے
شاعری کو تجھ پہ تھا، اب زندگی کو ناز ہے

اسرار اکبر آبادی

آوارہ پنچھی

ایک پنچھی آوارا
سانولی گھٹاؤں کی
سرمئی سی چھاؤں میں
دھیرے دھیرے اڑتا ہے
مجھ کو ایسا لگتا ہے
جیسے ایک شاعر کے
چاند سے تخیل نے
اپنے دستِ نازک سے
خوش جمال فطرت کی
نرم نرم زلفوں میں
ایک گل سجایا ہے
اور وہ ہواؤں میں
خود بخود مہکتا ہے
ایک پنچھی آوارا

دانش فرازی

دوسرا روپ

ایک وہ شام جدائی تھی ملول اور اداس
ایک یہ صبح ملاقات ہے آلودۂ غم
جیسے کچھ دیر سے محسوس یہ ہوتا ہے مجھے
شاخِ گل، موجِ صبا، نغمہ طرازانِ چمن
جلوۂ صبحِ بہاراں کی پھبن
اپنی دھرتی کے نہیں، اپنے گلستاں کے نہیں
غیر مانوس سا لگتا ہے تبسم تیرا
تیری آنکھوں سے چرائے ہیں کسی نے وہ چراغ
جس سے روشن تھی کبھی رہگذرِ ذوقِ جمال
تیرے عارض کی سلگتی ہوئی آگ
جانے کس رات کی شبنم سے بجھی
تیرے ہونٹوں کے کنول
جانے کس دھوپ سے مرجھائے ہیں
تو وہی ہے یہ بھلا کیسے یقیں ہو مجھ کو
میں اگر مان بھی جاؤں تو یہ کہہ سکتا ہوں
تو ابھی دور ہے اور تیرا الجھتا سایہ
میرے خوابوں کے قریب آیا ہے

ارشد صدیقی

غزل

قلبِ و نظر کا سکوں اور کہاں دوستو
کوئے بتاں دوستو! کوئے بتاں دوستو

میرا ہی دل ہے کہ میں پھرتا ہوں یوں خندہ زن
کم نہیں پردیس میں جی کا زیاں دوستو

جن میں خلوصِ وفا اور نہ شعورِ ستم
مجھ کو بٹھایا ہے یہ لا کے کہاں دوستو

مجھ کو گرانباریِ طوق و سلاسل بھی کم
تم کو سبکساریِ دل بھی گراں دوستو

رازِ غمِ زندگی کس پہ عیاں کیجئے
اک دلِ پُر خوں تھا سو وہ بھی کہاں دوستو

لاکھ چھپو سایۂ گیسوئے شب رنگ میں
مل نہیں سکتی مگر غم سے اماں دوستو

چار گھڑی رات ہے آؤ کہ ہنس بول لیں
جانے سحر تک ہو پھر کون کہاں دوستو

ربط و مراسم کے بعد ترکِ تعلق غلط
آگ بجھانے سے بھی ہوگا دھواں دوستو

شاعرِ ارشد ہوں میں شاعرِ فطرت ہوں میں
مٹ نہیں سکتا مرا نام و نشاں دوستو

مراسلات

حزیں اور صولت جنگ کی رفاقت عظیم آباد یا پورنیہ میں!

۱۵ر نومبر کے ہماری زبان میں محمد سلیمان صاحب کا ایک مراسلہ "حزیں اور صولت جنگ کی رفاقت" سے متعلق نظر سے گزرا جس میں فاضل مراسلہ نگار نے پروفیسر بیدل عظیم آبادی کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ حزیں نے صولت جنگ کی رفاقت میں عظیم آباد میں زندگی بسر کی ہے۔ لیکن تمام تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ میر باقر حزیں نے صولت جنگ کی رفاقت میں زندگی بسر کی ہے۔

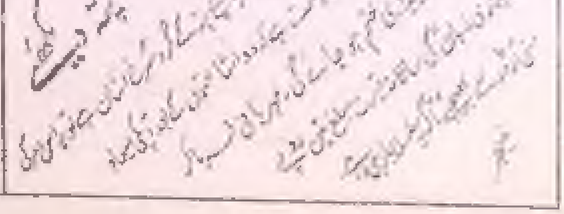
صاحب شعرالہند کا بیان ہے کہ میر باقر حزیں نے "نواب سعید احمد خاں صولت جنگ کی رفاقت میں نہایت عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کی ہے" (شعرالہند صفحہ ۱۵۴)

مولف گلشن نے لکھا کہ میر باقر حزیں "رفیق تھے نواب باقر جنگ سعید احمد خاں صولت جنگ کے زندگی بسر کی ہے انھوں نے ساتھ رعایت ناموننگ کے" (گلشن ہند صفحہ ۹۳)

اور چنانچہ بیدل اور سلیمان صاحب دونوں کو اس پر کوئی اختلاف نہیں۔ اختلافی امر یہ ہے کہ حزیں نے صولت جنگ کی رفاقت میں کہاں زندگی بسر کی، عظیم آباد میں، یا پورنیہ میں؟

اس سلسلے میں اتنا عرض ہے کہ اگر صولت جنگ کے حالات ہمارے سامنے رہیں تو کسی نتیجے پہنچنا آسان ہو جائے اور کوئی الجھن باقی نہ رہے۔

نصیرالملک نواب سعید احمد خاں بہادر صولت جنگ برادرزادہ و داماد نواب علی وردی خاں مہابت جنگ، نواب معین الدین سیف خاں فوجدار پورنیہ کے مرنے پر ۱۱۶۱ھ میں پورنیہ کے فوجدار مقرر ہوئے اور ۱۱۶۹ھ یا ۱۷۵۶ء میں پورنیہ ہی میں انتقال کیا اور وہیں کے محلہ جعفری باغ میں مدفون ہوئے۔ نواب موصوف سات سال تک پورنیہ کے فوجدار رہے۔ گو اس سے پہلے بھی اڑیسہ، رنگپور اور ہوگلی کی فوجداری پر نواب علی وردی خاں مہابت جنگ نے ان کو مامور کیا تھا لیکن ایک تو ان کے لئے یہ سخت خلفشار اور پریشانی کا دور تھا دوسرے یہ مدت اتنی نہ تھی کہ ان کو علمی و ادبی مجلسوں کو ترتیب دینے اور علماء و فضلاء کو اپنے دربار سے وابستہ کرنے کا موقع ملتا۔ لیکن پورنیہ کی فوجداری کا عرصہ خاصا لمبا اور اطمینان بخش



ہونے کی وجہ سے انھوں نے ملک کے چیدہ چیدہ علماء و فضلاء کو اپنے دربار میں بلالیا۔ مثلاً ملا غلام یحیٰی بہاری، مفتی ضیاء اللہ، میر وحید، مولوی لال محمد، شیخ ہدایت اللہ، سید عبدالہادی، وغیرہ مصنف سیرالمتاخرین غلام حسین بھی ان کی رفاقت و مصاحبت میں سال تک پورنیہ میں رہے۔ علم و ادب کے دلدادہ اور سرپرست تھے، اور باقاعدہ روزانہ علماء و ادباء کی مجلس میں شرکت کرتے جب تک بقید حیات رہے، یہ مشغلہ جاری رہا جیسا کہ صاحب سیرالمتاخرین کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ خود حزیں کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے نواب صولت جنگ کی رفاقت میں عظیم آباد میں نہیں بلکہ پورنیہ میں زندگی بسر کی ہے۔ نکات الشعراء میں جس کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے حزیں کے متعلق "بہ بنگالہ رفت" درج ہے۔ (نکات الشعراء صفحہ ۱۰۱)

اسی طرح تذکرہ میر حسن میں بھی حزیں کے باب میں "از دتے بر بنگالہ رفت" ہی درج ہے۔ اور ۱۱۶۲ھ تا ۱۱۶۹ھ وہ زمانہ ہے جب صولت جنگ پورنیہ کے فوجدار تھے۔ لہٰذا یہ بات بالکل صاف ہے کہ حزیں صولت جنگ کی رفاقت میں عظیم آباد میں نہیں بلکہ پورنیہ میں رہے۔ (اکمل یزدانی)

اُردو تلفظ اور تحریر

ہماری زبان مورخہ دسمبر ۱۹۶۱ء کے شمارے میں اقبال کرشن صاحب کا ایک مراسلہ (اردو تلفظ اور تحریر سے متعلق بعض مشورے) نظر سے گزرا اس میں لکھا ہے: "جب آپ افسانہ سے افسانے، پیسہ سے پیسے اور فرشتہ سے فرشتے نہیں لکھتے تو پھر مصرع سے مصرعے کیوں؟ مصرے کیوں نہیں!

ہماری زبان میں حرف "ع" تو الف ہو کر رہ گیا ہے
ہم بولتے تو ہیں मिसरा مگر لکھتے ہیں मिसरे !"

اقبال کرشن صاحب کے علم میں ہوگا کہ اردو میں لفظ کی جمع بناتے وقت کبھی ے، کبھی وں، ان، کبھی ات بڑھا دینے کا طریقہ رائج ہے۔ مثلاً: پیسہ، فرشتہ، افسانہ وغیرہ کے آخر میں، اگر ے بڑھا دی جائے تو لفظ واحد نہیں رہتا جمع بن جاتا ہے، لیکن یہ صرف ایسے ہی الفاظ میں بڑھائی جاتی ہے، جس کے آگے ہائے ہوز (ہ) مخلوط ہو کر لکھی ہوئی ہو اور ایسے موقع پر مخلوط ہ کو ے بڑھاتے وقت حذف کر دیا جاتا ہے، اس طرح: افسانہ سے افسانے، پیسہ سے پیسے، فرشتہ سے فرشتے وغیرہ۔ لیکن اگر ہائے ہوز (ہ) کسی لفظ کے آخر میں سالم طور سے لکھی ہوئی ہے اور کسی حرف میں مخلوط نہیں ہے۔ تو پھر ایسے کسی بھی لفظ سے اس کو حذف نہیں کیا جاتا، مثلاً: نگاہ، راہ، ان کی جمع نگاہوں، نگاہیں، راہوں، راہیں ہوئی، راہے، نگاہے نہیں۔ باقی کسی ایسی لفظ (جس کے آخر میں ہ نہیں ہے) اس کے آخری حرف کو جمع بناتے وقت

ضائع نہیں کی جاتا۔ البتہ بعض ایسے مواقع پر بھی ہائے ہوز (جہاں غیر ملفوظ لکھی ہوئی ہے) حذف کر دی جاتی ہے، مثلاً: زندہ سے زندگی، پائندہ سے پائندگی، لیکن یہ بات صحیح بنانے کے اصول میں نہیں ہے۔ یہ الگ ایک مسئلہ ہے۔

تیسرے الف اور ع دونوں مختلف الصوت ہیں۔ الف کو منہ سے ادا کرتے وقت، نیچے کا ہونٹ سکڑتے ہوئے اوپر کی جانب اٹھتا ہے، اور زبان اوپر کے دانتوں کے اندرونی مسوڑوں کے حصے کو چھوتی ہے۔ اور ع حلق کے ابتدائی حصے اور زبان کے آخری حصے کی جنبش سے ادا ہوتا ہے۔ اگر علم یافتہ طبقہ یا غیر علم یافتہ طبقے کو الف اور ع کی صوت میں امتیاز برتنے میں تکلف ہے تو یہ ان طبقوں ہی کی کمزوری ہے۔ ہر ایک عرب الف اور ع کو باقاعدہ طور سے مختلف صوت میں ادا کرتا ہے۔

مراسلہ نگار نے نظریے، ثاثب، کوئین QUEEN فائن FINE آف OF آن ON آل ALL بال BALL کال CALL بوائے BOY ٹائے TOY آف OFF وغیرہ الفاظ کے غلط تلفظ ادا کرنے کی طرف بھی دھیان دلایا ہے۔

دراصل ان الفاظ میں کچھ ایسے ہیں جو تنہا حرف علت اور کچھ ایسے ہیں جو دوہرے حروف علت رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں (اردو داں طبقے میں) عام طور پر صوتیات سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے، اس سبب سے عوام و خواص میں تنہا حرف علت اور دوہرے حروف علت میں اشعوری طور سے لفظ کو ادا کرتے وقت امتیاز نہیں رہتا۔ ضرورت ہے کہ یہ چند الفاظ یا اس نوع کے دیگر مسئلوں کے بجائے صوتیات پر کچھ جامع کام کیا جائے تاکہ یہ مسئلہ از خود حل ہو سکے۔

(دور آفریدی - بمبئی)

ابتدائی درسی مسئلہ

(حروف تہجی)

یکم دسمبر ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں جناب عبد الودود صاحب کا ایک مضمون زیر عنوان "ہندی الفاظ اور اردو رسم الخط" شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے میرے اس مضمون پر تبصرہ فرمایا ہے جو ۸ دسمبر ۱۹۶۰ء کے ہماری زبان میں "ہندی ماترائیں اور اردو اعراب" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ مضمون نگار نے اعراب جیسی پیچیدہ اور خشک بحث سے دلچسپی لی اور میرے بعض اصولوں کو سراہا۔

اسی سلسلے میں میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ کسی مضمون پر تبصرہ کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ حوالے کے لئے تبصرہ کا عنوان وہی رکھا جائے جس پر تبصرہ کیا گیا ہو تاکہ قارئین کے سامنے اس عنوان کی تمام بحثیں آ جائیں اور وہ اس پر مزید روشنی ڈال سکیں۔ عنوان ہذا پر ہمارے دو اور مضامین (۲۲ جون اور یکم ستمبر ۱۹۶۱ء) اور دو تبصرے (۸ فروری اور ۱۵ جولائی) بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کے مطالعے سے موصوف کی بعض غلط فہمیاں ختم ہو جائیں گی۔

ایک معلم ہونے کی حیثیت سے میں بری طرح محسوس کرتا رہا ہوں کہ ہمارا موجودہ اردو قواعد اور ابتدائی درسی طریقہ کافی حد تک اصلاح طلب ہے کیونکہ جب میں نے ہائی اسکول میں موجودہ اردو قواعد کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو دیکھا کہ اس میں زیادہ تر عربی اور فارسی کی ہی تقلید کی گئی ہے اور اس کے اکثر اصطلاحوں کی تقسیم و تعریف بھی بالکل مبہم اور غیر واضح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے طلبہ موجودہ اردو قواعد پڑھ کر پورا پورا فائدہ نہیں اٹھاتے اور انھیں قواعد پڑھنے سے عام فہم عبارتوں میں صحیح صحیح بولنا اور لکھنا نہیں آتا بلکہ تحریری اظہار خیال کے لئے انھیں کافی مشق اور مہارت پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

حسن اتفاق سے مجھے ابتدائی درجوں میں اردو کی پڑھائی دیکھنے اور اپنی نگرانی میں اردو کا پہلا درجہ چلانے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہاں بھی میں نے دیکھا کہ جہاں ہندی پڑھنے والے بچے ۲-۳ ماہ میں عام فہم ہندی پڑھنا سیکھ جاتے ہیں وہاں اردو پڑھنے والے بچے ابھی حروف تہجی میں ہی لگے رہتے ہیں اور عام طور پر معلمین اپنے طریقوں میں اصلاح کرنے کی بجائے یہی کہہ کر اطمینان کر لیتے ہیں کہ اردو ہندی کے مقابلہ میں سہل الحصول نہیں ہے۔

ان حالتوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں موجودہ اردو قواعد کے مختلف اصطلاحوں پر غور اور اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کے سہل الحصول، قابل فہم اور سائنٹفک طریقوں کی کھوج کروں تاکہ ایک طرف جہاں ہمارے بچے کم وقت اور محنت میں

مخزن القوافی

مجھے مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد یمین السلطنت حیدر آباد کی کتاب "مخزن القوافی" [illegible] درکار ہے۔ اگر کوئی صاحب قیمتاً دینا چاہیں تو مطلع فرمائیں۔ ورنہ ایک ہفتے کے لئے نقل کرنے کے لئے مرحمت فرمائیں۔

آنر بھارتی۔ اردو اکیڈمی

۸۴ - امین بائی لائنز۔ انبالہ چھاؤنی

عام فہم اُردو پڑھنا سیکھ لیں وہاں ان میں عام فہم عبارتوں میں صحیح صحیح اظہار خیال کرنا بھی آجائے۔ اور جب یہ باتیں پوری ہوجائیں تو ان کے ہاتھوں میں دلچسپ اخلاقی، دینی، سماجی اور اقتصادی کتابیں دے کر ان میں مطالعہ کا شوق پیدا کردیں اور اگر ہم مطالعہ کا شوق پیدا کرسکے تو ان میں چند شہرت بھی حاصل کرسکتے ہیں، اور میرے خیال میں یہی اُردو کی صحیح معنوں میں سچی خدمت ہوگی۔

چنانچہ میں نے پہلا درجہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر اُردو پڑھانے کے سہل الحصول طریقوں کی تلاش کرنے لگا میں نے ایک نظریہ قائم کیا۔ اس پر اپنے آپ تنقیدیں کیں، اپنے ساتھیوں سے تنقیدیں کرائیں، اپنے علاقہ کے بااثر حضرات کے سامنے اپنا اصول پیش کیا، ملک کے بڑے بڑے بزرگوں سے مشورے لئے اور ہماری زبان میں اپنے اصولوں پر کئی مضامین بھی شائع کرائے۔ الغرض اس کام میں پورے چھ سال لگ گئے اور کافی ردوکد، بحث و مباحثہ اور کاٹ و چھانٹ کے بعد میں نے اپنا ایک آخری اصول قائم کیا اور بعد میں یہ فیصلہ کیا کہ ان تمام پیچیدہ عنوانات کو ہماری زبان کے صفحات پر موضوع بحث بناؤں تاکہ اعلیٰ پیمانہ پر غور کیا جاسکے۔

لہٰذا اسی مقصد کے تحت میں نے ابتدائی درسی مسئلے کے سب سے پیچیدہ عنوان "اعراب" پر ہماری زبان میں مضامین شائع کرائے؛ حروف علت، حروف صحیح اور اعرابوں کے متعلق اپنا نیا رجحان قارئین کے سامنے پیش کیا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر اس بحث سے کوئی نتیجہ نکل سکا تو آئندہ میں حروف تہجی، حروف علت، اعراب، بیچے دوسری زبانوں کے غیر مانوس الفاظ اور قواعد کے قابل تفصیل اصطلاحات کو یکے بعد دیگرے زیر بحث لاؤں گا۔ مگر بدقسمتی سے میرے ایک چھوٹے سے مضمون میں ہی بہت سے مسائل زیر بحث آگئے، حالانکہ ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ غور کرنے کی ضرورت تھی۔

اگر واقعی ہم ان مسائل پر غور کرنا اور اُردو کو دنیا کی ایک سہل الحصول زبان بنانا چاہتے ہیں تو آئیے ہم اس کی تمام خامیوں کو دور کرنے، دنیا کی ساری خوبیوں کو اپنانے اور اس کی زیادہ سے زیادہ سالمیت برقرار رکھنے کے جذبہ سے مختلف مسائل پر باری باری سے غور کریں۔ میں ابتدائی درسی مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس بحث میں حصہ لیں اور اپنے قیمتی مشورے عام فہم عبارتوں میں لکھ کر ہماری زبان میں شائع کرائیں تاکہ ابتدائی مدرسوں میں کام کرنے والے معلمین بھی ان سے استفادہ کرسکیں۔

حروف تہجی - ابتدائی درسی مسائل میں حروف تہجی سب سے پہلا مسئلہ ہے۔ اُردو زبان میں عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کے کچھ مخصوص حروف تہجی شامل کرلئے گئے ہیں تاکہ ان زبانوں کے الفاظ کا صحت کے ساتھ تلفظ ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں انگریزی میں حروف تہجی کی تعداد صرف ۲۶ ہے وہاں اُردو میں منجملہ پچاس (تمام حروف کا تلفظ اس طرح کریں گویا ان پر زبر دیا ہوا ہو۔ "حروف کا تلفظ" عنوان میں اس کو واضح کیا جائے گا) "ا، ب، بھ، پ، پھ........ک کھ، گ، گھ، ل م ن و ہ، ھ، ء، لا، ی اور ے حروف شامل ہیں۔ اس فہرست میں ھ، ء، لا۔ تو کسی بھی حالت میں حروف نہیں ہیں کیونکہ ان میں 'ھ' محض ایک علامت ہندی ہی ہے جو اُردو کے کچھ حروف کے ساتھ مل کر ہندی کے حروف بناتی ہے اور اس علامت کے مل جانے سے اُردو کا ب، بھ - پ، پھ اور ک، کھ ہوجاتا ہے اور ان کا ہندی کی طرح رواں تلفظ کرتے ہیں۔ ہم 'ھ' کو 'ہ' کہہ کر خود تو غلط فہمی کا شکار ہوتے ہی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے بچوں کو بھی اُلجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ اُردو زبان میں بھی 'ھ' کا استعمال بطور 'ہ' کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔

پتہ نہیں دوسری جگہ بھ، تھ وغیرہ کا معلم بچوں سے کس طرح تعارف کراتے ہیں۔ مگر صوبہ بہار میں معلمین "بے میں دوچشمی ہے لگانے سے بھے اور تے میں دوچشمی ہے لگانے سے تھے ہوئے" کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کی نظروں میں بھ، پھ وغیرہ گویا مخلوط حروف ہی نہیں۔ میں انہیں مخلوط حروف کے بدلے مفرد حروف ہی مانتا ہوں کیونکہ یہ ہندی کے مفرد حروف کے قائم مقام ہیں۔ میں بچوں سے ان کا اس طرح رواں تلفظ کراتا ہوں۔ اُردو حروف میں جب یہ نشان 'ھ' لگاتے ہیں تو ب، بھ، اور اسی وزن پر پ پھ اور ت، تھ ہوجاتے ہیں۔

(باقی صلا پر)

انجمن کا خبرنامہ

مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یاد میں

انجمن ترقی اُردو شاخ دہلی کا جلسہ

۵؍ جنوری کی شام کو پنڈت سندر لال صاحب کی صدارت میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یاد میں انجمن ترقی اُردو شاخ دلی کی نشست ہوئی۔

پنڈت جی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ میرے ان مسلمان دوستوں میں حکیم صاحب بھی شامل ہیں جو ہمیشہ مجھے یاد رہیں گے۔ اور جن کی ذات گرامی میرے لئے مشعل راہ بنی۔ حکیم صاحب کا شمار کانگرس کے ان لیڈروں میں ہے جنھوں نے اس کو زندگی بخشی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں جب پہلی مرتبہ ہندو مسلمانوں میں جھگڑے ہوئے اور گاندھی جی نے ۲۱ دن کا برت رکھا تو حکیم صاحب کی کوشش ہی سے ہندو مسلم اتحاد ہوا اور دلی کی فضا خوش گوار ہوئی۔ میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ حکیم صاحب ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جن کے دل میں کبھی بھی کدورت نہیں آئی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں ان کے اکثر ہندو احباب بھی جب ان کو سمجھانے جاتے تو تیکھی گفتگو کرتے لیکن حکیم صاحب ان طنزیہ باتوں کو ہنسی میں ٹال جاتے تھے اور بہکے ہوئے لوگوں کو راہ پر لے آتے تھے۔

"گاندھی جی کو حکیم صاحب پر پورا اعتماد تھا۔ دلی میں اگر حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری نے کانگرس کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو یہاں کام ہونا بہت مشکل تھا۔ طبیہ کالج میں بھی طب یونانی اور آیورویدک کی پڑھائی کا طریقہ ساتھ رکھ کر حکیم صاحب نے یہ چاہا تھا کہ اس طرح جو بھی طلبہ وہاں سے پڑھ کر نکلیں یونانی اور ہندوستانی دونوں علاج کے ماہر ہوں۔ حکیم صاحب کی صفات بیان کرنے کے لئے وقت بھی درکار ہے اور قابلیت بھی۔ دلی کی پرانی تہذیب شائستگی کا وہ مکمل نمونہ تھے۔"

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے حکیم صاحب مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ وقت ایسا ہے کہ حکیم اجمل خاں جیسی بڑی ہستی کا تعارف بھی کرانا مشکل ہے کیونکہ ان کی اعلیٰ صفات کو سمجھنے کے لئے اس دور کے لوگوں میں ہمت نہیں ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ آزادی کی تاریخ میں کہیں بھی حکیم اجمل خاں کا نام نظر نہیں آتا حالانکہ کانگرس کی بنیاد جن لوگوں نے مضبوط کیا ان میں حکیم صاحب بھی شامل تھے۔ یہ بہت بڑی ناانصافی ہے۔ وہ ایسے ہی پائے کے لیڈر تھے جیسے گاندھی جی اور مولانا آزاد۔ ان کے کاموں کو یاد رکھنا گویا اپنی تاریخ آزادی کو دہرانا ہے اور ان کی اعلیٰ صفات سے آج کل کے لوگوں کو سیکھنے کا بھی موقع ملتا۔ اس ملک کے بنانے میں ان کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا ان کے اور ساتھیوں کا تھا۔ ہندو مسلم ایکتا کا لفظ جو آج بار بار دہرایا جاتا ہے اس دور میں نہیں تھا۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں میں بے نوائی آگئی ہے اور ان کی بات کا وزن چلا گیا ہے، حکیم اجمل خاں کے زمانہ میں ایسا نہیں تھا۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کا مزاج ایسا ہے کہ یہاں کوئی بڑا کام ہندو مسلم اتحاد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بغیر کسی وقتی مصلحت کے انھوں نے ہمیشہ دلی کے لوگوں میں میل جول رکھنے کی کوشش کی، حالانکہ نہ ان کو کوئی پارلیمنٹ یا اسمبلی کی ممبری درکار تھی نہ وزارت کی کرسی۔ اس زمانے کے ہندو مسلمان بلا تفریق مذہب و ملت حکیم صاحب کے اشاروں پر چلتے تھے اس لئے انگریز حکام بھی ان سے مرعوب تھے اور ان کو دلی کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا تھا۔"

نور الدین احمد چیرمین طبیہ کالج نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں بقول پنڈت سندر لال جی کے ایسا ہی مسلمان ہوں کہ مذہبی تفریق روا نہیں رکھتا۔ غالباً یہ دلی کی اس خوش گوار فضا کا اثر ہے جس میں میں نے آنکھ کھولی اور جس کے آخری نمائندے حکیم اجمل خاں تھے۔ اب تو تعصب کے روحانی مرض میں پورا ملک اس بری طرح مبتلا ہو گیا ہے کہ کوئی علاج کارگر ہوتا نظر نہیں آتا۔ مگر میرے لڑکپن میں ایسا نہیں تھا ۴۰ سال کی عمر تک دلی کے رہنے والوں میں میں نے کہیں کوئی تفریق نہیں دیکھی۔ ہولی، بسنت، دیوالی، دسہرہ، پھول والوں کی سیر، دلی کے ہندو مسلمان مل کر مناتے تھے اور موسم کی خوشگواری کا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ محرم میں دلی کے ہندو بھی سبیلیں رکھتے اور اپنے بچوں کو سبز کپڑے پہناتے اور تعزیوں کے جلوس میں پورے احترام سے شرکت کرتے تھے۔

"انگریزوں نے بہت پہلے ہندو مسلمان میں تفریق کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی لیکن یہ باہمی ملاپ کی بنیاد ایسی استوار تھی کہ پورے ڈیڑھ دو سو سال تک یہ لوگ کوشش کرتے رہے تب کہیں جا کر پہلی جنگ عظیم کے بعد جھگڑے شروع ہوئے۔ اس دور میں حکیم صاحب کو یاد کرنے کی ضرورت اس لئے ہم اور بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے باہمی میل ملاپ کی آخری نشانی تھے۔ ورنہ اس سے قبل ہر ہندوستانی ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کہ وہ تھے۔ گاندھی جی کا مقولہ تھا کہ ہندو مسلمان ہندوستان کے جسم کے دو ہاتھ ہیں اگر ان میں سے ایک ہاتھ بھی کام نہیں کرتا تو قوم مفلوج ہو جاتی ہے اور اب صورت حالات کچھ ایسی ہی ہو رہی ہے۔"

آخر میں جنرل سکریٹری نے مقررین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ حکیم اجمل خاں صاحب جیسا کہ سب دلی والے جانتے ہی ہیں "صرف اچھے طبیب اور اونچے درجے کے رہنما ہی نہیں، بلند پایہ ادیب اور خوش گو شاعر بھی تھے"

اُردو تو خیر اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ فارسی اور عربی میں بھی وہ شعر کہتے تھے اور شستہ تحلص کرتے تھے۔ ان کے دیوان خانے میں دلی کے نامی گرامی شعراء اور ادباء کا مجمع لگا رہتا تھا، اور مریضوں کے دیکھنے کے بعد ان کے وقت کا کافی حصہ علمی ادبی مشاغل میں گذرتا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ آج انجمن ترقی اُردو کی جانب سے ایک ایسے انسان کی یاد میں نشست کی گئی ہے جو بیک وقت نامور طبیب، قومی لیڈر اور بلند پایہ شاعر وادیب تھا۔"

(اسسٹنٹ سکریٹری)

انجمن ترقی اُردو شاخ ساگر

انجمن ترقی اُردو شاخ ساگر ۸ر فروری ۱۹۶۱ء تک نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے مرتبہ پروگرام کے مطابق ترقی کے مدارج طے کرتی رہی۔ ممبر سازی دفتر اور دفتر کی ضروریات، دارالمطالعے کا قیام، شبینہ مدارس کی تشکیل، مردم شماری کا کام، اُردو کانفرنس کا انعقاد اور اُردو زبان کی گھر گھر نشر واشاعت وتعلیم بالغان کے علاوہ جامعہ اُردو علی گڑھ کے درجہ ابتدائی کے نصاب کی تعلیم کا آغاز کرچکی تھی۔ اچانک گذشتہ سانحۂ عظیم نے سارا نقشہ بدل دیا اور انجمن کا سارا مجوزہ پروگرام مفلوج ہوکر رہ گیا جو ایک مسلسل محنت اور انتھک کوششوں کے ساتھ عمدہ رفتار سے چل رہا تھا۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ انجمن کی مجلس عاملہ کے ارکان وبعض مخلص اُردو نواز حضرات اس حادثہ سے افسردہ خاطر اور بددل نہیں ہوئے۔ بدلے ہوئے ماحول اور ناسازگار مالی اور اقتصادی مشکلات کے باوجود ایک نئی امنگ اور جوش کے ساتھ از سرِ نو انجمن کی بقا کے لئے سرگرم کار ہوگئے اور ایک قلیل مدت ہی میں انجمن کے مجوزہ پروگرام از سرِ نو جاری کردئے۔ آج انجمن اس بات کا اعلان کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتی ہے کہ حسب سابق مرکزی دارالمطالعے میں اخبارات ورسائل پڑھنے والوں کے لئے مہیا کئے جانے لگے ہیں اور انجمن کے مجوزہ منصوبہ کے تحت ایک لائبریری بھی قائم کردی گئی ہے جس کے لئے تقریباً تین سو معیاری کتابیں حاصل کرلی گئی ہیں اور امید ہے آئندہ جلد ہی پانچ سو کتابیں فراہم کی جاسکیں گی۔ سردست دارالمطالعے میں ۵ روزنامے ۵ ہفتہ وار، ۳ پندرہ روزہ، ایک سہ ماہی اور ۱۲ ماہنامے آنے شروع ہوگئے ہیں۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں شبینہ مدارس شہر کے اہم حلقوں میں جلد از جلد کھولے جارہے ہیں۔

علمی اور ادبی مجلسوں کے انعقاد کے لئے مناسب کارروائی عمل میں لائی جارہی ہے۔ تمام ادب نواز حضرات سے التماس ہے کہ ادبی وشعری مجالس میں حصہ لے کر اُردو دوستی کا فرض ادا کریں اور اُردو کی ترقی واشاعت کے لئے عملی قدم اُٹھائیں۔

انجمن ترقی اردو ساگر اپنے معاونین کی تہ دل سے شکر گزار ہے جنھوں نے بگڑے ہوئے حالات میں اپنے بیش قیمت مشوروں اور پُرخلوص تعاون سے انجمن کو نوازا خصوصاً مجاہد ملت جناب مولوی حفظ الرحمٰن صاحب، پروفیسر آل احمد سرور صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، محمد یوسف صاحب جامعی مالک مکتبہ شاہراہ اور مقامی حضرات میں جناب مولوی وحید الحسینی صاحب صدر، جناب ظہور اللہ صاحب وجناب سیٹھ محمد یونس صاحب وجملہ اراکین مجلس عاملہ جن کی بروقت امداد نے مسیحائی کا کام کیا اور آج انجمن پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوگئی۔

(محمد حسین خان۔ سکریٹری)

انجمن ترقی اُردو منگل داڑی

منگل داڑی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ قائم ہوئے ابھی دو سال ہی گزرے ہیں مگر اس قلیل مدت میں جو کام یہاں کی شاخ نے کیا ہے وہ بے مثل نہیں تو قابل داد وتحسین ضرور ہے۔ آسام میں (صرف کچھار کے ضلع کو چھوڑ کر) آسامی مادری زبان ہے۔ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی کہیں کہیں سمجھی جاتی ہے۔ اس پس منظر میں مقامی شاخ کے سامنے ایک ہی نصب العین رہا ہے یعنی اُردو کی درس وتدریس۔ "سنڈے کلاس" کی شہرت روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ مختلف شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے حضرات ذوق وشوق سے اُردو سیکھنے آتے ہیں۔ پروفیسر تارا چرن رستوگی درس وتدریس کے لئے اپنا بیش بہا وقت پرخلوص جذبے کے ساتھ دیتے ہیں۔ سنڈے کلاس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ اب ۴۴ طلبہ فارغ التحصیل ہوچکے ہیں۔ اس کلاس میں طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ ۱۹۶۱ء میں غالب، اقبال، چکبست پر سیمینار کئے گئے جن میں عوام کے استفادہ کے پیش نظر بیشتر تقریریں انگریزی ہی میں کی گئیں۔ مارچ ۶۲ء میں "سیماب" پر سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

(تارا چرن طاہر۔ معتمد انجمن ترقی اُردو منگل داڑی)

بقیہ

اُردو، مشترکہ تہذیب تمدن کی پیداوار ہے

ہندی اور فارسی لفظوں کی ترکیب کو معیوب سمجھا جانے لگا اور جو لفظ گھس گھسا گئے تھے انھیں پھر اصلی شکل میں رائج کرنے کی کوشش ہوئی۔ مثلاً نزدیک، بورچی، بستیس، اپرد وغیرہ۔ ان کی جگہ نزدیک، باورچی، ساتیس، اوپر وغیرہ کو جائز قرار دیا گیا۔ ناسخ نے ایک شعر میں "اور" کا لفظ باندھ دیا۔ تو اس پر اعتراض ہوا۔ انھوں نے میر کا کلام لے کر پیچھا چھڑایا:

رکھتا ہوں میر صاحب قبلہ سے میں سند
یہ جانتا نہیں کہ زبان ہے کہاں کی اور!

نتیجہ یہ ہوا کہ سینکڑوں سند کو مل شبد اور چٹخارے دار محاورے زبان سے نکل گئے۔ یہ پہلا انقلاب تھا۔ جس نے اُردو بھاشا کو جو دکن میں سیدھی سادی عام فہم زبان تھی، اُردو معلّیٰ کا جامہ پہنا دیا۔

اس موقع پر انگریز صاحب بہادر کا دور دورہ شروع ہوا ولزلی جیسا گھمنڈی حاکم ہندوستان پر برطانوی سامراج لادنے کے ارادے سے کلکتہ میں وارد ہوا۔ سامراجی افسروں کو حکومت چلانے کے قابل بنانے کے لئے ہندوستانی زبانیں سکھانا ضروری تھا۔ فارسی جو مغل شاہی دفتروں میں کام آتی تھی دشمنوں کی زبان تھی۔ جنھیں نیست و نابود کرنے کا بیڑا اٹھایا جا چکا تھا، اس لئے پرجا کی بھاشاؤں کو ترقی دینے اور انھیں پر چلنے کی ضرورت تھی چنانچہ ان غرضوں کو پورا کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج قائم ہوا فارسی کو تخت سے اتار کر کس زبان کو اس کی جگہ بٹھایا جائے، یہ ایک اہم سوال تھا۔ اس وقت اُردو کے مرکز تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ لاہور، دہلی، آگرہ، لکھنؤ، بنارس، پٹنہ، مرشد آباد، اورنگ آباد، حیدرآباد، ویلور غرض اکثر شہروں اور بہت سے قصبوں میں اُردو رائج اور بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مقبول تھی۔ اُردو کے علاوہ موجودہ ہندی کا درجہ محض بولی کا تھا برج بھاشا اور اودھی ادب کی زبانیں تھیں۔ لیکن ان میں کوتاہی تھی۔ یعنی نثر کا حصہ نہیں کے برابر تھا۔ اتر کی سب زبانوں میں اُردو ہی اس لائق معلوم ہوتی تھی کہ فارسی کی جگہ لے۔ قدرتی طور پر کالج کے استادوں نے اردو پر زور دیا۔ کلکتہ کے لوگوں نے جو اخبار نکالے ان میں بھی اُردو کے زیادہ اور ہندی کے کم تھے۔ (باقی)

بقیہ

ابتدائی درسی مسئلہ

'و' کو بھی حرف سمجھنا غلط ہے۔ میرے نزدیک تشدید کی طرح یہ بھی ایک علامت ہی ہے اور جب 'وَ' 'ی' اور 'ے' (ए) بہ ترتیب وار ان سے ہی بنے ہوئے اعراب (وٗ، (ओ) یٖ (ई) اور ے (ए)) دیتے ہیں تو انھیں کو رکھ استعمال نہیں کر کے اس نشان 'و' سے ہی نمایاں کرتے ہیں۔ جیسے ک + و (को) = کو، کَ + و (कौ) = کَو، کی، ی (की) = کی، کِی + ی (कै) = کَی، کَ + ے (के) = کے، ے + ے = ے (لمبا) ان تین صورتوں کے سوا 'و' کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ اور اگر آپ اس کو حرف سمجھتے ہیں تو بتائیں کہ ان پر زبر، زیر اور پیش وغیرہ اعراب دینے سے ان کا تلفظ کیا ہوگا؟

اب 'لا' کو لیجئے۔ اس کو تو کسی بھی حالت میں حرف نہیں سمجھا جا سکتا۔ 'لا' 'ل' میں 'ا' اعراب جوڑنے سے بنا ہے اس لئے لا حرف نہیں بلکہ ایک لفظ ہے۔

کچھ حضرات کہتے ہیں کہ اُردو میں ہم صوت حروف (ج، ذ، ز، ژ، ض، ظ) کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لئے ایسے حروف کی فہرست سے ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ جب عربی ہی اُردو کے تمام الفاظ کا صحت کے ساتھ تلفظ نہیں کرتی تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم عربی الفاظ کو صحت کے ساتھ پڑھنے کے لئے حروف تہجی کی اتنی لمبی فہرست بنائیں۔ میں ہم صوت حروف کی تعداد کم کرنے کی تائید کر سکتا ہوں لیکن یہ کبھی بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ تمام ہم صوت حروف اُردو سے ہٹا دیئے جائیں کیونکہ اس طرح اُردو زبان کی خوبیاں ختم ہو جاتی ہیں چنانچہ ہندی جس میں ہم صوت حروف نہیں ہیں غم کا گم، گز کا گج، خط کا کھت اور غیں کا گیل تلفظ کرتی ہے جو سننے میں کانوں کو اچھے نہیں لگتے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ علمی دنیا میں اردو اتنی مقبول ہو رہی ہے اور اردو داں ہندی رسم الخط اپنانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہاں البتہ 'ژ' کو حروف تہجی کی فہرست سے ضرور خارج کر دینا چاہئے اور اس کا کام 'ز' سے ہی لینا چاہئے کیونکہ 'ژ' کا استعمال اُردو میں بھی بہت کم ہوتا ہے۔ (اس بحث کے بعد کا عنوان "حروف کا تلفظ" ہوگا) (ایم ولے حسن جھنجھروی)

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا

وریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

رائے بہادر شنکر دیال نگار لکھنوی

نام شنکر دیال، نگار تخلص، ولادت ماہ ستمبر ۱۸۶۹ء۔ آپ کے والد بابو برج بہادر صاحب ریلوے ڈپارٹمنٹ میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ نگار صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد انگریزی کی طرف رجوع ہوئے اور انٹرنس اور ایف۔ اے کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی اور وظیفہ پایا۔ ۱۸۹۲ء میں بی۔ اے کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ۱۸۹۳ء میں وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور وکالت شروع کردی۔ ۱۸۹۹ء میں منصف کے عہدے پر فائز ہوئے اور رفتہ رفتہ ڈسٹرکٹ و سیشن جج کے ممتاز عہدے پر مامور ہوئے۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں رائے بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں جج کے عہدے سے پنشن پائی ۱۹۳۳ء میں عالم فانی سے ملک جاودانی کو راہی ہوئے۔ "گنجینۂ معرفت"، "ادم مالا" اور "بادۂ عرفان" تین کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔

"گنجینۂ معرفت" شریمد بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ ہے اس کی زبان پاکیزہ اور ترجمہ عام فہم ہے اور اس میں آپ نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ منور لکھنوی، نظر سیوہاروی اور اثر لکھنوی کی طرح نگار صاحب کا یہ ترجمہ اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

"ادم مالا" ایک طولانی نظم ہے جسے آپ ہر روز عبادت کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ بقول بیخود موہانی مرحوم "یہ نظم مذمت دنیا، ترک دنیا وحمد و ثنائے ذات وصفات الٰہی کا گنجینہ ہے۔ زبان کی سلاست، مطالب کی متانت، خیالات کی رفعت ہر آئینہ قابل داد ہے۔"

"بادۂ عرفان" آپ کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کی غزلوں میں لطف زبان، ترنم و حکمت و معرفت، اخلاقیات اور عرفانیت کی خصوصیات ملتی ہیں۔

جناب نگار غزل بھی کہتے تھے اور نظم بھی اور دونوں اصناف سخن میں استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کے کلام پر بیخود موہانی مرحوم فرماتے ہیں:-

"آپ کے اشعار آپ کا مرقع ہوتے ہیں۔ آپ کے کلام میں آپ بیتی بہت زیادہ اور جگ بیتی بہت کم ہے۔ سارا کلام اخلاقی اور عرفانی شاعری سے مملو ہے اور ایک ایسا خزانہ ہے جس میں نہایت بیش بہا جواہر ریزے نظر آتے ہیں۔ ذات وصفات الٰہی اور بے ثباتی دنیا وغیرہ کی تصویریں اس میں بکثرت ہیں۔ مذمت دنیا اور احساس فرائض آپ کے خاص موضوع ہیں۔"

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمایئے:-

الٰہی سلامت رہے میری ہیری ‏ ‏ یہی ہے مرے ساتھ جانے کے قابل
دکھا کے مجھے حشر کی انجمن میں ‏ ‏ یہ منہ کب رہا ہے دکھانے کے قابل

درد ہوں سوز ہوں، فرقت ہوں، تمنا میں ہوں
سو بکھیڑے ہیں مرے ساتھ وہ تنہا میں ہوں
اپنی بہار ہوں نہ چمن کی بہار ہوں
قسمت مری کہ گلشن ہستی کا خار ہوں
کیا پوچھتا ہے عشق کی مجبوریوں کا حال
بے اختیار گریۂ بے اختیار ہوں

کچھ سمجھ میں مری آتا نہیں ہوتا کیا ہے
قطرے قطرے کو ہے یہ زعم کہ دریا کیا ہے
میری پستی میں ملی حد کی بلندی کو پناہ
میں وہ ذرہ ہوں کہ آگے مرے تارا کیا ہے

ہے کچھ عجیب چیز سہارا امید کا
آنکھوں سے اشک گر کے زمیں پر سنبھل گئے

نہ اک ذرے کو بھی بے قدر جانو
یہ دنیا ایک موتی کی لڑی ہے

کیا جانے کیا کرے دل بے اختیار تو
مجھ کو جو ایک پل بھی خدا اختیار دے

موت بن جائے گی آخر ایک دن ‏ ‏ زندگی ہے دشمن جانی مری
دشت محشر بن گیا باغ و بہار
رنگ یوں لائی پشیمانی مری

محبت وطن کے متعلق چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں، سنیئے:-

کیا تھا یہ ہند پہلے جو ہے وطن ہمارا
دنیا کے باغ میں تھا یکتا چمن ہمارا
سب سے قدم ہمارا ہر علم میں تھا آگے
یکتا تھی اپنی صنعت یکتا سخن ہمارا
کوہ ہمالیہ سے تا انتہائے لنکا
ہر جا رہا ہے جھنڈا اسا یہ فگن ہمارا
وہ فوج تھی ہماری جس سے زمیں تھی لرزاں
ہر ایک فیل جنگی تھا صف شکن ہمارا
ہیئت میں ہم تھے کامل حکمت میں ہم تھے یکتا
اک مسئلہ رواں تھا ہر اک سخن ہمارا